حسرت موہانی کے سیاسی افکار و نظریات

Mohammad Arif

Research Scholar Department of Urdu

تلخیص: مولانا حسرت موہانی کا سب سے ممتاز اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سے پہلے مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا اور اس طرح ہند کے تمام باسیوں کے دلوں میں مکمل آزادی کی جوت جگادی۔ حسرت کا مسلک دراصل کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے الگ تھا۔ وہ مصلحت پسندی کے بلکل خلاف تھے۔ اور ملک عزیز کو جلد از جلد آزاد دیکھنا چاہتے تھے اس کے لئے انہوں نے کئی دفعہ سیاسی جماعتیں چھوڑیں، قید کی مشقتیں برداشت کیں اور برطانوی حکومت کو اقتصادی طور پر کمزور کرنے کے لئے تحریک سودیشی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خود بھی شودیشی اسٹور کھولا۔

کلیدی الفاظ: سیاستداں، صحافی، تحریک آزادی، انقلاب، سودیشی تحریک، کانگریس، برطانوی سامراج، مصلحت کوشی، بائیکاٹ۔

اردو کے صف اول کے منفرد شاعر، صاحب طرز ادیب، ممتاز نقاد، نباض ادب، تذکرہ نگار، نامور صحافی، تحریک آزادی میں پیش پیش رہنے والے اور جنگ آزادی کے عظیم مرد مجاہد سید فضل الحسن حسرت موہانی ایک مختلف النوع اور گوناگون شخصیت کے حامل تھے۔ سیاست ان کی زندگی کے نورانی پہلوؤں میں سے ایک اہم ترین پہلو ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، جس کے بغیر جنگ آزادی کی داستان نامکمل سی معلوم ہوتی ہے۔ حسرت موہانی کے سیاسی نظریات کی تشکیل میں دو اہم تحریکوں کا بنیادی حصہ تھا، جن کی نوعیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور متضاد تھی۔ ان میں سے ایک ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی تھی جو کلی طور پر انگریز دشمنی کے جذبات کی پیداوار تھی اور دوسری تحریک سرسید احمد خاں کی تھی جو انگریز دوستی کے جذبات پر مبنی تھی۔ مؤخر الذکر تحریک کے نتیجہ میں ۱۸۵۷ء میں مدرسۃ العلوم عمل میں میں آیا جس نے آگے چل کر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی شکل اختیار کر لی جو حسرتؔ کی مادر درسگاہ بنا اور آج علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔

مولانا حسرت موہانی نہ صرف ایک بہت بڑے شاعر تھے بلکہ بہت بڑے انقلابی بھی تھے۔ ان کی سیاسی زندگی طوفان انقلاب کا پتہ دیتی ہے۔ اپنے مضامین اور تقریروں کے ذریعہ انھوں نے قوم کو جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لئے اکسایا۔ سرسید نے مسلمانوں کو سیاست سے علیٰحدہ رکھا تھا حسرت موحانی نے کانگریس کی اہمیت کو جتایا اور اسمیں مسلمانوں کی شرکت کو قومی جنگ آزادی کی ایک اہم ضرورت قرار دیا۔ حسرتؔ کی دلیری اور جانبازی، خلوص وایثار اور ان کی آزادی وبیباکی ایسی خصوصیات تھیں جو ایک سچے انقلابی کے لئے ضروری ہیں۔

حسرتؔ نے جس زمانہ میں سیاست کے میدان میں قدم رکھا اس وقت اس میدان میں آنے سے بڑے بڑے لوگ گھبراتے تھے یہ زمانہ برطانوی سامراجیت کے شباب کا زمانہ تھا محبان وطن کے لئے اس وقت کی سیاست زنجیر و زندان کی سیاست تھی۔ حکومت کے کسی بھی پالیسی کے خلاف لب کشائی ناقابل معافی جرم تھا اور محض شک وشبہ کی بنیاد پر لوگوں کو زندان میں ڈال دیا جاتا تھا۔ ب ۱۸۹۷ء میں بال گنگادھر تلک کی ایک تقریر کو سرکار کی

مخالفت قرار دے کر ان کو ۱۸ مہینے کی سزا دی جا چکی تھی۔ برٹش حکمران ہندوستانی صنعت کو کچلنے کے لئے ان پر کمر توڑ ٹیکس لگا رکھے تھے۔ ان باتوں کا ردّ عمل بھی ہو رہا تھا کہ محبان وطن نے برطانوی سامراج کے خلاف آوازیں اٹھانی شروع کر دی تھی اور معاشرہ سیاسی و تہذیبی انگڑائیاں لینے لگا تھا۔

اس پر آشوب، تشدد و بربریت، نفرت و خصومت اور جد وجہد کی فضا میں حسرت نے اپنا بچپن گزارا، جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی سیاسی و سماجی معاملات میں عملی طور پر حصہ لینے لگے۔ ایسے عالم میں جب مضبوط اعصاب کے لوگ بھی حکومت کی دست درازیوں کے خلاف مہر بہ لب تھے ایسے وقت میں حسرت موہانی ان سرفروشوں کی صف میں جا کھڑے ہوئے جو ظلم کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے سیاسی عقائد کے سبب بہت سی مصیبتیں برداشت کیں۔ بی۔ اے۔ کی ڈگری مکمل کرنے بعد بجائے اس کے کہ کوئی سرکاری نوکری یا عہدہ تلاش کرتے بلکہ وہ علی گڑھ میں ہی مقیم ہو گئے۔ اور ۱۹۰۳ء میں وہیں سے اردوئے معلی کے نام سے ایک رسالہ کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی اہمیت کا بھی حامل تھا۔ اسی سال سے وہ انڈین نیشنل کانگریس کے مجلسوں میں بھی شامل ہونے لگے۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :

''مرحوم نے ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی اور مذاق زمانہ کے خلاف کسی اعلیٰ ملازمت کے بجائے علم و فن اور شعر سخن کی خدمت کا تہیہ کیا اور اردوئے معلی کے نام سے ایک بلند پایہ ادبی رسالہ علی گڑھ سے جاری کیا۔۔۔۔۔ اردوئے معلی نوجوان جدید تعلیم یافتہ گروہ کی ادبی خدمت کا دوسرا قدم تھا، مگر مرحوم کی طبیعت میں جو تضاد تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اردوئے معلی کے صحن میں شعر و سخن کے چمنستان کے ساتھ سیاست کا خارستان بھی نظر آیا۔ چنانچہ اس زمانہ میں جب مسلمان سیاست سے جھجھکتے تھے علی گڑھ کا یہ بے باک نوجوان گریجویٹ کانگریس میں شامل ہو گیا۔''

ان کے ذہن میں ان کا مقصد واضح ہو چکا تھا اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنے قلم کا بڑی جرائتمندی اور بے باکی سے استعمال کر رہے تھے۔ اردوئے معلی کے ستمبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں تحریر فرماتے ہیں :

''ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ سرسید اپنے زمانے میں قوم کے رہنما تھے اور اس وقت مسلمانوں کے حق میں انہوں نے جو کچھ کیا بہتر کیا۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیٰحدہ ہونے کی نصیحت اس بنا پر کی کہ غدر کے بعد سرکار انگلشیہ مسلمانوں سے بدگمان تھی اور ان کو بغاوت کا ملزم سمجھتی تھی، تو خوب کیا۔ اگر انہوں نے مسلمانوں کی توجہ کو تمام ملکی معاملات سے علیٰحدہ کر کے صرف اعلیٰ تعلیم کی طرف مائل کیا تو اور بھی خوب کیا۔ لیکن ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا زمانے کی اب بھی وہی حالت ہے جو سرسید کے وقت میں تھی؟ ہم کہتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر ننگ و عار کا موجب کون امر ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی فلاح و بہبود کے لئے خود کوشش نہ کریں، بلکہ دوسروں کی حمایت پر بھروسہ رکھیں اور اپنے جائز حقوق کے طلب کرنے سے صرف ایک خیالی نفع کی امید کی وجہ سے باز رہیں۔ ''

حسرت نے جس وقت علی گڑھ میں قدم رکھا اگرچہ اس وقت علی گڑھ تحریک آخری سانسیں لے رہی تھی لیکن کانگریس تحریک کی مخالفتیں اب بھی ہو رہی تھیں۔ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے اندر جرأت نہیں تھی کہ وہ سیاسی طور پر انگریزوں کے کے خلاف سوچیں یا کوئی اقدام کریں۔ حسرت نے اس روایت کو توڑا اور کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔

کانگریس میں دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک مصلحت پسند اور نرم مزاج گروہ جو سیاسی قرار دادوں کے ذریعہ انگریزوں کو ناراض کئے بغیر ہر طرح کے مراعات اور آسانیاں حاصل کرنے کا خواہان تھا۔ اس اعتدال پسند گروہ کی رہنمائی دادا بھائی نوروجی، گوپال کرشن گوکھلے اور سریندر ناتھ بنرجی وغیرہ کر

رہے تھے۔ دوسرا گروہ انتہا پسند اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے تشدد کی حد تک پہنچ جانے والوں کا تھا۔ یہ گروہ قرار دادوں کے بجائے پر زور احتجاج کا حامی تھا۔ حق مانگنے کے بجائے حق چھین لینے پر یقین رکھتا تھا۔ گروہ کی رہبری بال گنگا دھر تلک کر رہے تھے۔ اعتدال پسند گروہ کا کہنا تھا کہ محض قرار دادوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کے حقوق اور رعایتوں کی مانگ کی جائے جب کہ انتہا پسند گروہ بضد تھا کہ اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے احتجاجات اور مظاہروں سے کام لینا چاہئے۔

۱۹۰۷ء میں سورت میں کانگریس کا اجلاس ہوا اور اس اجلاس میں یہ اختلاف شدت اختیار کر گیا، جس کے نتیجہ میں بال گنگا دھر تلک اپنے حامیوں کے ساتھ کانگریس سے الگ ہو گئے تو حسرت موہانی بھی ان کے ساتھ کانگریس سے علیٰحدہ ہو گئے۔ حسرت موہانی اپنی حریت پسندی، بیباکی اور باغیانہ طبیعت کے زیر اثر انتہا پسند گروہ سے منسلک رہے، اردوئے معلی میں کانگریس کی موافقت میں آواز اٹھاتے رہے اور لوگوں کو اس کی سرگرمیوں سے باخبر کرتے رہے۔ حسرت نے اردوئے معلی کو ایک تحریک کی شکل دے دی، اس کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر سیاسی بصیرت و آگہی کی آبیاری کی، نہایت دلیری کیساتھ مصلحت کوشی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ہندوستانی سیاست کے علاوہ بین الاقوامی اور مسلم ممالک کی سیاست سے ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کو مطلع کیا۔

حسرت موہانی کی سرشت اور فطرت میں بغاوت تھی، چاہے ادب کا میدان ہو یا سیاست اور صحافت کا ہر میدان میں باغیانہ قدم اٹھایا۔ یہی سبب ہے کہ وہ اس وقت سیاست کے میدان میں سرگرم نظر آتے ہیں جب ساری امت مسلمہ اسے شجر ممنوعہ سمجھ کر اس سے دوری اختیار کر تھی۔

حسرت موہانی فقط ایک بڑے شاعر نہ تھے بلکہ بہت بڑے انقلابی بھی تھے ان کی سیاسی زندگی طوفان انقلاب کا پتہ دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے مقالوں اور تقریروں کے ذریعہ امت مسلمہ کو جنگ آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کے لئے برانگیختہ کیا۔ سرسید مسلمانوں کے کانگریس میں شامل ہونے کے خلاف تھے حسرت نے کانگریس کی اہمیت سے لوگوں کو آگاہ کیا اور مسلمانوں سے اپیل کہ کہ وہ جوک در جوق کانگریس میں شامل ہوں۔ حسرت اردوئے معلی کے شمارہ ستمبر ۱۹۰۴ء کے مضمون بعنوان ''نیشنل کانگریس اور پولیٹکل ایجیٹیشن'' میں لکھتے ہیں :

''ہم دعوے کے ساتھ کہ سکتے ہیں کہ جو لوگ اس زمانہ میں بھی کانگریس کی شرکت کو مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتے ہیں ان کے پاس سوائے اس کے اور اور کوئی قوی دلیل نہیں ہے کہ ہم سرسید کی پالیسی کی پیرو ہیں۔۔۔۔۔۔ غرض یہ کہ اس ساری تحریر کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ سرسید نے جو پالیسی اختیار کی تھی اسے ہم بمقتضائے وقت اس زمانے کے لئے صحیح بھی مان لیں تو اب اس پر قائم رہنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے، وہ ضرورتیں نہیں ہیں، وہ مصلحتیں نہیں ہیں اس لئے کیا وجہ ہے کہ اب وہ پالیسی بھی غلط نہ قرار دی جائے۔ ''

حسرت کی جانبازی، جرأت، بے نیازی، خلوص، نیک نیتی، قربانی کا جذبہ، آزادی کا ولولہ اور بے لوث خدمت ایسی خصوصیات تھیں جو ایک سچے اور ایماندار انقلابی کے لئے ضروری ہیں۔

حسرت نے اپنے سیاسی نظریات و معتقدات کی تبلیغ و ترویج کے لئے اردوئے معلی کو ایک مؤثر ذریعہ کے طور پر استعمال کیا۔ کانگریس کے جلسوں اور کارروائیوں کی رپوٹیں ہوں یا کانگریس کی طرفداری میں مسلم لیڈروں کی تحریریں، ترک موالات کی تحریک کا معاملہ ہو یا آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے اور تبصرے، علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کی مانگ ہو یا انگریز افسروں کی سیاسی چالوں کا تجزیہ و تحلیل، اردوئے

معلی کے اوراق ان تمام ملکی اور قومی مسائل سے پر رہتے تھے۔اس کے ذریعہ سودیشی تحریک، غیر ملکی اموال کے بائیکاٹ، یونیورسٹی کے الحاق اور دیگر ضروری مسائل پر آزادانہ گفتگو کی جاتی تھی۔

حسرت موہانی کا مسلک دراصل کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے الگ تھا۔ وہ ہندوستان کی کسی بھی سیاسی جماعت یا گروہ سے زیادہ باغیانہ طبیعت کے مالک تھے وہ صحیح معنوں میں باغی اور سرکش تھے۔ وہ اس وقت تک بغاوت کرنا چاہتے تھے جب تک کہ ہندوستان میں کوئی ایسا نظام نہ رائج ہو جائے جس میں انسان عزت وعافیت کے ساتھ زندگی گزار سکے، جو سب کے فلاح وبہبود کے لئے ہو اور جو نظام انسانی ناموس کی حفاظت کے لئے لازم ہے وہ انگریزی حکومت کو ایک ناجائز اور غیر طبیعی حکومت تصور کرتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ یہ حکومت زیادہ دنوں تک حریت اور آزادی کی آواز کو دبانہ پائے گی اور آخر کار یہی ہوا کہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئی۔ انگریزی حکومت بھی حسرت کو اپنے لئے ایک بڑا خطرہ خیال کرتی تھی اور ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھتی تھی۔ برطانوی حکومت کے دفتر میں حسرت کا نام نمبر ۳ تھا اور جب کبھی حسرت سفر پر نکلتے تو ایک جگہ کی پولیس دوسری جگہ کی پولیس کو خفیہ طور پر اطلاع دیتی تھی تو ان کو نمبر ۳ ہی کہتی تھی۔

واقعات غدر کے بعد حسرت موہانی اردو شاعروں میں سب پہلے سیاسی قیدی تھے۔ جب انہیں ۱۹۰۸ء میں رسالہ اردوئے معلی میں ایک مضمون شائع کرنے کے پاداش میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑا۔ جیل کے اندر حسرت کے ساتھ بڑی زیادتیاں ہوئیں۔ خصوصاً چکی پیسنے کی مصیبت جس کا آپ نے کاص طور سے ''مشاہدات زنداں'' میں بھی ذکر کیا ہے۔ تقریباً سال بھر تک ایک من آٹا پیسنے کی سخت مشقت سے سابقہ رہا جو عام طور پر دیگر صوبوں میں ایک ماہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن پولیٹکل قیدیوں کے ساتھ نسبتاً زیادہ سختیاں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف آواز اٹھانے اور ہندوستان کے لئے مکمل آزادی کی مانگ کرنے کے جرم میں انہیں ۱۹۱۶ء اور اس کے بعد ۱۹۲۲ء بھی گرفتار کر کے مقید کیا گیا لیکن حسرت نے ملک عزیز کی آزادی کی خاطر ان سبھی مشکلات کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حسرت پر جو افتاد پڑی وہ بڑے سے بڑے قائد اور لیڈر کو ڈگمگا دینے اور اس کے حوصلوں کو پست کرنے کے لئے کافی تھیں لیکن یہ تمام مشکلیں اور سختیاں حسرت کے اعصاب کو متزلزل نہ کر سکیں۔ بلکہ حسرت ان مشکلات کا سامنا کرتے کرتے مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔ جس کے نتیجے میں حسرت کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلی ہم رہاں سے ہم!

حسرت کا سب سے ممتاز اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سب سے پہلے مکمل آزادی کا ریزولیشن پیش کیا اور اس طرح ہندوستان کے تمام باسیوں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان سب کے دلوں میں مکمل آزادی کی ایک جوت جگادی۔ وہ حریت کے جذبے کو اپنی جان اور اپنے اطمینان اور سکون سے زیادہ ترجیح دیتے تھے اور اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی خاطر کسی بھی طرح کی قربانی سے گریز نہ کرتے تھے۔ اگرچہ اس زمانہ میں اس تخیل کے لئے فضا ہموار نہ تھی اور اپ کو مخالفانہ و معاندانہ ردّ عمل سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ مگر ان کے پائے ثبات میں کوئی لرزش نہیں پیدا ہوئی اگرچہ انہیں ناقابل بیان صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلم لیگی ان کے مخالف ہو گئے۔ کانگریسی ان سے بدگمان ہو گئے، تحریک خلافت کے

اراکین ان سے بد ظن ہو گئے اور ان سے کوئی ربط ضبط باقی نہ رکھا۔ مگر وہ آہنی ارادوں والا اور مضبوط اعصاب کا مالک مجاہد آزادی اپنی جگہ پر ثابت قدم رہا اور اس کے آیڈیولوجی اور سیاسی نظریات مین ذرا بھی لچک نہیں پیدا ہوئی۔ خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی

واللہ کبھی خدمت انگریز نہ کرتے

کتابیات:

۱۔ حسرت کی سیاسی زندگی، مولانا سید سلیمان ندوی، مشمولہ نگار ۱۹۵۲ء، صفحہ ۱۱۲

۲۔ اردوئی معلی، ستمبر ۱۹۰۴ء

۳۔ اردوئی معلی، ستمبر ۱۹۰۴ء